© rasailojaraid.com

مذہبی رواداری

مولانا قاری محمد حنیف جالندھری
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

18 جنوری 2011 کو اسلام آباد میں وفاقی وزارت مذہبی امور پاکستان کے زیر اہتمام ''علماء ومشائخ کنونشن'' منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ناظم اعلی وفاق المدارس العربیہ پاکستان حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے ''مذہبی رواداری'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل تحریر پیش کی، افادہ عام کی غرض سے قارئین وفاق کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔[ادارہ]

مذاہب کے درمیان مفاہمت اور مکالمہ کی بات ایک عرصے سے دنیا بھر میں چل رہی ہے اور مختلف مذاہب اور نظریات کے حضرات اس پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ عام طور پر اس حوالہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان رواداری، مفاہمت اور مکالمہ وگفتگو کی فضا کو فروغ دینا ہر دور میں ضروری رہا ہے مگر اب جبکہ فاصلوں کے مسلسل سمٹتے چلے جانے کے بعد دنیا ایک گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کر رہی ہے، اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ رہی ہے تاکہ مختلف مذاہب اور عقائد ونظریات کے لوگ مل جل کر ایک سوسائٹی میں رہ سکیں اور مذہب کے حوالہ سے جو اختلافات ہیں، وہ کشمکش اور تصادم کی صورت اختیار نہ کریں۔

مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کشیدگی اور تنازعات کے شدت پسندانہ اظہار کو بھی اس ضرورت کی ایک وجہ قرار دیا جارہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تصادم، محاذ آرائی اور قتل وقتال کا جو سلسلہ صدیوں جاری رہا ہے، اس کا تسلسل آج بھی موجود ہے اور عنوان تبدیل ہونے کے باوجود وہ مذہبی شدت پسندی اور انتہا پسندی بدستور انسانی معاشرے میں موجود ہے۔

گزشتہ صدی میں یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان جو کچھ ہوا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک ''ہولوکاسٹ'' کے حوالہ سے بیان کی جانے والی تلخ داستان کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے اور مسیحی مذہب کے کیتھولک پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس فرقوں کے درمیان طویل خانہ جنگی کی صدائے بازگشت شمالی آئرلینڈ کی فضاؤں میں اب بھی سنائی دیتی ہے، جبکہ مشرقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ کے ممالک کے کمیونزم کے شکنجے سے نکل جانے کے بعد وہاں کی مسلم آبادی بالخصوص بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے، الغرض مسلمانوں اور مسیحیوں، مسیحیوں اور یہودیوں، فلسطین میں یہودیوں اور مسلمانوں اور مختلف ادوار میں ان مذاہب کے باقی فرقوں کے درمیان داخلی طور پر خونریزی اور تصادم کی ایک لمبی تاریخ ہے جو مختلف محاذوں پر اب بھی جاری ہے اور اس صورت حال کو قابو میں لانے کے لئے اہل مذاہب کے درمیان مکالمہ اور مفاہمت کے فروغ کے لئے مختلف سطحوں پر کام ہو رہا ہے۔

اس تصادم اور خونریزی کو ختم کرنے کے لئے ایک حل یہ تجویز کیا گیا ہے جس پر دنیا کے ایک بڑے حصے میں عمل ہو رہا ہے کہ سرے سے مذہب کے وجود کی یا کم از کم سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے اس کے تعلق کی نفی کر دی جائے اور مذہب سے انکار یا اسے محض فرد کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اس کے معاشرتی کردار کو ختم کر دیا جائے، لیکن یہ سوچ اور طریق کار منفی اور غیر فطری ہونے کی وجہ سے بالآخر ناکام ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کے مختلف معاشروں میں مذہب کے معاشرتی کرداروں کی واپسی کا عمل دھیرے دھیرے بڑھتا نظر آ رہا ہے جس نے دانش کی اعلیٰ سطح کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ مذہب کی نفی کرنے کی بجائے مذہب کے کردار و عمل کو باہمی مفاہمت و مکالمہ کے ذریعہ آگے بڑھایا جائے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مذاکرات و مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ حقیقت ایک بار پھر انسانی سوسائٹی میں خود کو تسلیم کراتی دکھائی دے رہی ہے کہ مذہب ایک فرد اور انسان کی بھی ضرورت ہے اور معاشرہ اور سوسائٹی کی بھی ضرورت ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ مفروضہ بھی محض تکلف کی حیثیت رکھتا ہے کہ چونکہ مذہب کی وجہ سے تنازعات جنم لیتے ہیں اور باہمی تصادم اور خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس کی نفی کر دی جائے، کیوں کہ مذہب کے علاوہ اور بھی عوامل موجود ہیں جو انسانی سوسائٹی میں منافرت، باہمی جنگ وجدال اور قتل وغارت کا باعث بنتے ہیں۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اسباب میں مذہب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور قومیت، رنگ ونسل، علاقائیت، زبان اور نسلی عصبیت کا انسانوں کو لڑانے اور خون بہانے میں کردار کسی سے مخفی نہیں ہے، اس لئے مذہب کو سوسائٹی میں جنگ وجدال، انتہا پسندی اور قتل وغارت کا باعث قرار دے کر اس کی نفی کرنے اور سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے مذہب کے بے دخل کرنے کا فلسفہ غیر فطری اور غیر حقیقت پسندانہ ہے اور اسی وجہ سے اسے کامیابی کی طرف بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا۔

مذہبی رواداری کا ایک اور فلسفہ آج کل زیر بحث ہے کہ تمام مذاہب کے مشترکات کو جمع کر کے ایک مشترکہ مذہب تشکیل دیا جائے اور جن اقدار و روایات کی سوسائٹی کو ضرورت ہے، انہیں ایک ''متحدہ مذہب'' کی صورت میں فروغ دیا جائے۔ اسی فلسفہ کے تحت پانچ سو سال قبل برصغیر میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے ''دین الٰہی'' تشکیل دیا تھا، جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی سوسائٹی کے مزاج اور نفسیات سے مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا اور اسی کا ناکام تجربہ آج کل ''بہائی مذہب'' کی طرف سے اس طرح کیا جا رہا ہے کہ بعض بڑے مراکز میں تمام مذاہب کی عبادت گاہیں ایک چھت کے نیچے بنا کر یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ ''اتحاد بین المذاہب'' کی عملی صورت ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار ایک چھت کے نیچے اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کرتے ہیں، مگر یہ غیر فطری تجربہ بھی ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پا رہا اور ایک محدود اور مخصوص طبقہ کے سوا کسی کی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔

''بین المذاہب مفاہمت'' کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر طبقہ اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے اس پر عمل کرے، مگر دوسروں کا وجود تسلیم کر کے ان کا احترام ملحوظ رکھے اور باہمی احترام اور مفاہمت کی فضا قائم کی جائے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں اور جس طرح دور نبوی اور خلافت راشدہ میں مسلمانوں اور اسلام کی راہ میں مزاحمت نہ کرنے والے غیر مسلموں کے درمیان جس طرح تعلقات رہے ہیں اور خلفائے راشدین نے اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق و مفادات کا جس طرح تحفظ کیا ہے وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جبکہ بنو امیہ، بنو عباس، بنو عثمان (عثمانی ترک خلفاء) اور اندلس کی مسلمان حکومت کے زمانے میں غیر مسلم جس امن کے ماحول میں اسلامی ریاست میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں، اسے اس رواداری اور برداشت کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون اور معاشرتی رویہ میں غیر مسلموں کے لئے رواداری اور مفاہمت کا جو ماحول پایا جاتا ہے اس کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ پاکستان میں رہنے والی اقلیتوں کو تمام وہ حقوق حاصل ہیں جو بنیادی اور شہری حقوق میں شمار ہوتے ہیں لیکن دو تین معاملات ایسے ہیں جن میں تحفظات پائے جاتے ہیں اور بین المذاہب مفاہمت کے فروغ کی کوشش میں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً دستور پاکستان ملک کی مسلم اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو سب کے اتفاق سے منظور اور نافذ ہوا ہے، اگر سب لوگ اس دستور کے مطابق چلیں تو کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا، لیکن جب اس دستور کو یا اس کے اسلامی تشخص کو چیلنج کیا جاتا ہے تو شکایات پیدا ہوتی ہیں اور مسلمان اکثریت کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں ہوتی کہ پاکستان کی اسلامی بنیادوں اور دستور کے اسلامی تشخص کی نفی کی جائے۔

دوسرے نمبر پر حقوق کے نام پر جب کچھ عناصر پاکستان کے اسلامی تشخص کے خلاف عالمی استعمار کی یلغار اور مہم کا حصہ بنتے ہیں تو اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ناموس رسالت کے تحفظ کا قانون دیکھ لیجیے، جب اسے مکمل طور پر ختم کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس سے عالمی سیکولرازم کے اس ایجنڈے کی تائید ہوتی ہے جس پر وہ پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لئے عمل کر رہا ہے۔ اس قانون کے مبینہ طور پر غلط استعمال کو روکنے کی بات اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف ہے ہے اور سرے سے قانون کو ختم کر دینے کی بات قطعی طور پر اس سے الگ ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی توہین تمام مذاہب میں سنگین جرائم کی فہرست میں آتی ہے اور اس پر موت کی سزا بائبل میں بھی مذکور ہے، اس لئے جب اسے قانون سے بالکل ختم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے تو اس سے کسی مذہب کی نمائندگی نہیں ہوتی، بلکہ مذہب کی نفی کرنے والے عالمی سیکولرازم کی تائید وتقویت ہوتی ہے، جس سے مسلمانوں کو شدید اختلاف ہے۔

اسی طرح قادیانیت کا مسئلہ ہے کہ قادیانی گروہ سرے سے پاکستان کے دستور کو تسلیم نہیں کر رہا اور منتخب پارلیمنٹ کے متفقہ دستوری فیصلہ کو مسترد کر رہا ہے، اس لئے جب مذہبی آزادی کے نام پر قادیانیوں کے اس غیر دستوری اور غیر جمہوری رویے کی تائید کی جاتی ہے اور انہیں سپورٹ کیا جاتا ہے تو اس سے مسلم اکثریت کے جذبات کا مشتعل ہونا فطری بات ہے۔

مقصد یہ ہے کہ "بین المذاہب مفاہمت" کے فروغ اور مکالمہ بین المذاہب کے لئے جب ہم بات کرتے ہیں تو اس کے اہداف ہمارے سامنے ہونے چاہئیں اور ابہام کی فضا میں مذہبی شدت پسندی کا عنوان دے کر مذہبی حلقوں کو خواہ مخواہ ہدف تنقید بنا کر ہمیں کنفیوژن میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔ گول مول باتوں اور ابہام کی فضا سے کنفیوژن بڑھتا ہے اور مسائل حل ہونے کے بجائے مزید الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

"اسلامی جمہوریہ پاکستان" میں بین المذاہب مفاہمت کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہم سب اس دستور کا احترام اور اس کی حدود کی پابندی کریں، جو ہمارے درمیان سوشل کنٹریکٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم سب نے اس کی وفاداری کا عہد کر رکھا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ باہمی شکایات ومشکلات کا حل ہمیں اپنے ملک کے اندر اور دستور کے دائرہ میں تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کے لئے پاکستان کے بارے میں مخصوص منفی ایجنڈا رکھنے والے عالمی استعمار کو ملکی معاملات میں دخل اندازی کا موقع دینے سے گریز کرنا چاہئے کہ یہ ملکی مفاد کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ مسائل و مشکلات کے حل کے لئے بھی کسی صورت میں فائدہ مند نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف مذاہب کے راہنماؤں کے درمیان وقتاً فوقتاً بیٹھنے اور مشترکہ مسائل اور مشکلات وشکایات پر غور کرنے اور باہمی مشاورت واعتماد کے ساتھ ان کا حل تلاش کرنے کا کوئی ایسا نظام ضروری ہے جو نارمل حالات میں بھی قائم رہے اور ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ اس کے ذریعہ جاری رہے۔

© rasailojaraid.com